ڈاکٹر رخسانہ بلوچ
استاد شعبہ اُردو،گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

ہندو مسلم سماج اور نظیر اکبر آبادی کی انسان دوستی

Dr. Rukhsana Baloch
Assistant Professor, Department of Urdu, GCW University, Faisalabad.

Hindu-Muslim society and Nazir Akbar Abadi's humanism

Since the advent of globalization, the world is facing various challenges. The rift in one nation sometimes becomes a frightening incident for the whole world.Therefore, there is a dine need to ascertain the peace of the world. It is possible when we not only tolerate the rituals and traditions of others but also try to be a part of it.Hence, the people will realize that we share their happiness or grief. This vital concept is presented and highlighted in the unprecedented of "NAZEER AKBAR ABAADI" in Urdu poetry. He nourished the ideology of tolerance and love for humanity. This article deals with the same idea.

Key Words: *Globalization, Facing, Various, Challenges, Nation, Incident, Ascertain.*

سماج کی ترقی میں سب سے اہم کردار ریاست یا حکومت ادا کرتی ہے۔ترقی پسند سماجوں میں عوام سے ریاست مضبوط ہوتی ہے۔اس سماج میں عوام کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔لیکن برصغیر میں حکمرانی کا تصور ترقی پسند سماجوں کے تصور سے بہت مختلف تھا۔اصل میں ترقی پسند سماج میں حکمران ہمیشہ مقامی ہوتا ہے اور اس کی جڑیں عوام میں ہوتی ہیں ،وہ عوام کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہے لیکن غیر ترقی پسند سماج میں حکمران غیر ملکی ہوتا ہے۔برصغیر میں بھی غیر ملکی حکمرانوں کا عرصۂ اقتدار مقامی حکمرانوں کے عرصۂ اقتدار سے زیادہ طویل تھا۔اور غیر ملکی حکمرانوں کو عوام کے طرزِ معاشرت سے خاص دلچسپی تھی۔ان کی غرض صرف مالگزاری اور خراج کی وصولی تک تھی،انھیں عوام کے حالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔کمزور طبقے کا استحصال سماج میں مساوات اور انصاف کے سم قاتل ہے،جو بدامنی اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔ترقی پسند سماجوں میں ملکیت کے تصور،معاشرے کی طبقاتی تقسیم،فکری بیداری اور مذہبی اجارہ داری نے اجتماعیت کے تصور کو جنم دیا جب کہ برصغیر میں اجتماعیت کا تصور آج تک بیدار نہ ہو سکا۔اس تصور کی بیداری کے لیے رعایا کے مفادات کا ایک ہونا اور ان کے مفادات کی وکالت کرنے کے لیے ایک سیاسی قیادت کا ہونا شرط تھا اس کے برعکس ایک طرف برصغیر میں بادشاہ اور رعایا کے درمیان حائل دوری نے کبھی ایسے مواقع پیدا ہی نہ ہونے دیئے کہ رعایا اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بادشاہ کے گوش گزار کر سکے۔دوسری طرف ہند جغرفیائی لحاظ سے تو ایک ملک ہے لیکن اس میں بسنے والوں کے الگ الگ اعتقادات، رسوم ورواج،طرزِ بودوباش،زبان،مختلف آب وہوا کے باعث مختلف وسائلِ زندگی اور الگ الگ مفادات نے

انھیں کبھی ایک قوم نہ بننے دیا۔ قومی لحاظ سے مغائرت اور بیگانگی کے علاوہ مذہب کی تعلیمات نے لوگوں کو ظلم سہنے کا اس قدر عادی بنادیا کہ وہ اپنے حق کے لیے لڑنے پر ظلم سہنے کو ترجیح دینے لگے، یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں انفرادی سطح پر کاریگر اور صناع تو بہت ملتے ہیں لیکن ٹیم ورک کا تصور تقریباً مفقود ہے۔ اس انفرادی کوشش میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا۔

سماج کے متعلق اسلامی نظریہ اوپن سوسائٹی کا تھا۔ جس میں نسل، خاندان اور ذات کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ برصغیر کے تہذیبی انقلاب میں نومسلم طبقے کا بڑا رول تھا۔ انھوں نے اپنا مذہب تو ضرور تبدیل کرلیا تھا لیکن اپنی رسمیں، اپنی عادتیں نہ چھوڑیں اور نہ ہی اپنے شوق کو ترک کیا۔ اس طرح ایک متحد ہندو مسلم سماج کا وجود ہوا جس میں بہت سی ہندوؤں کی سماجی خصوصیات تھیں۔ صوفیا کرام نے اس ہندو مسلم سماج میں انسان دوستی کو فروغ دیا۔ نسان دوستی کے پرچار میں جہاں صوفیا کرام کا ہاتھ ہے وہاں شاعروں نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔[1]

دورِ جدید، وطنی تحریکات، نئے نئے فلسفیانہ نظریات اور عالم گیر تصورات کا دور ہے۔ اس سے پہلے تک ہمارا شعر و ادب صرف صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتا رہا، کبھی منظم اور کبھی غیر منظم انداز میں۔ اس 'یک جہتی' کے اہم اجزا کے مختلف روپ تھے۔ مثلاً احترام انسانیت، رواداری و بے تعصبی، وطن اور مشاہر وطن سے وابستگی، سماجی فلاح و بہبود کی سیدھی سادی کوششیں وغیرہ۔ وہ اکائی جو ریاست کا حکمران جوڑ سکتا تھا، اس نے تو نہ جوڑی لیکن عوامی کوششوں سے رواداری کی روایت پروان چڑھتی گئی۔

اس بات کی اہمیت سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ نوع انسانی کی وحدت کا عقیدہ نہایت دور رس نتائج کا حامل ہے۔ انسان دوستی کی ایک شرط جہاں خلوص اور دل سوزی ہے وہاں متعلقہ حقوق کی حفاظت بھی ہے۔ خواجہ غلام السیدین کی مشہور کتاب روح تہذیب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اس اشتراک کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے جوڑتا ہے۔ نیز اپنے کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنے کا رویہ بالکل ترک کردیا جائے۔ آج جس انسانی عظمت کی ضرورت پر زور دیا جارہا ہے اسے ہمارے شاعروں نے سینکڑوں سال تصوف کے روپ میں پیش کیا، ہر شخص کی قدر پہچانی، عام اس سے کہ وہ کون ہے کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ مثلاً ان کا سارا اس ایک شعر میں ڈھل گیا ہے:

حاصل حسن و عشق بس ہے یہی
آدمی آدمی کو پہچانے

عشق کے اس نظریے نے احترام آدمی اور محبت کی قدروں کو اپنا کر انسانی مزاج کی عصبیتیں ختم کردیں، صوفیائے کرام کی نظر میں انسان اپنے مرتبے اور صلاحیت کے اعتبار سے قدرت کا ایک شاہ کار تھا۔ وہی تہذیب و تمدن کا اہل بھی تھا اور سب سے زیادہ محبت اور سلوک کا مستحق بھی۔ گویا ان کا مقصد ہی انسان کو انسان کا مقام یاد دلانا تھا جو تہذیب نفس کے بغیر ناممکن تھا۔ ان کا عمل پیغمبرِ اسلام کے اس ارشاد کے مطابق تھا کہ اگر مجھ کو یقین ہو جائے کہ کل قیامت آنے والی ہے تب بھی میں زمین میں کھجور کا ایک نیا پودا لگاؤں گا۔ یہ رویہ انسانیت کی نفع رسانی اور تخلیقی تربیت کا عجیب و غریب رویہ تھا جو دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ پیش ہوا۔

اردو کے ابتدائی دور ہی میں تصوف اور بھگتی کے اثرات کی بنا پر اس کے ادب میں انسانی عظمت کا نظریہ جگہ پا گیا۔ اس روایت کا آغاز شمال میں امیر خسرو اور جنوب میں گیسو دراز سے ہوا۔ پھر میراں جی، جانم، خوب محمد چشتی، گام دھنی ،ولی، سراج، محمود بحری، حاتم، میر، درد وغیرہ اور بھگتی میں کبیر اور سور داس نے اپنا حصہ ڈالا۔ مسلمان شعرا کے ہاں ہندو مذہب کے اوتاروں پر نظمیں اور ہندو شعرا کا نعتیہ کلام اس انسان دوستی کا مظہر تھا۔

مختلف قوموں کی رواداری کی ایک شان دار مثال ایک دوسرے کے معتقدات اور روایات کے پر خلوص اظہار میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ نظموں اور کتابوں کا آغاز کبھی حمد و نعت اور کبھی سرسوتی اور گنیش کے ذکر سے ہوتا تھا۔ ان کے مصنفین ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی۔ کبھی کبھی ایک ہی مصنف کے یہاں دونوں باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً احمد سراوی نے نل دمن کا آغاز تو حمد و نعت سے کیا مگر اس کا اختتام اس دوہے پر کیا۔

ہوں نرگن اوگن کہی تو جگ کا کرتار
ان نرگن کے کارکنی اوگن مری بسار

نظیر اکبر آبادی نے بھی کشن جی، موہن، مدن گوپال، کانھ جھنڈ والے، برج راج، گون چریّا، ماکھن اُچکّے، گوورد ھن، من ہرن وغیرہ نام بڑے چاؤ سے استعمال کئے ہیں۔ ان کی ساری نظمیں ایسی لگتی ہیں جیسے کسی (بھگتی کال کے) ہندی شاعر نے لکھی ہوں۔

یہ بات کہ کسی قوم کے تیج تہوار کی بنیاد مذہب پر ہوا کرتی ہے اپنی جگہ پر ہے مگر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ تمدنی عناصر کے غلبے میں تہواروں کا مذہبی پہلو کم زور ہو کر ان میں کھیل تماشے اور تفریحی پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک زراعتی ملک ہونے کی بنا پر یہاں مختلف رسموں اور تہواروں کی بھرمار تھی۔ ہولی کھلینا، گلال اڑانا، لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا، بسنت کی خبر ہونا جیسے محاورے اور ضرب الامثال ہماری گفتگو کا حصہ بن گئے۔ اس لیے نظیر کے ہاں ہمیں ہولی، دیوالی اور دوسرے تہواروں پر نظمیں ملتی ہیں۔ موضوع کا انتخاب کرتے وقت وہ کسی نظریے یا عقیدے کی پاسداری نہیں کرتا۔ بس کوئی تہوار ہو، وہ تہوار مسلمانوں کا ہو یا وہ تہوار ہندوؤں کا ہو، وہ ہر ایک کو ایک سی لگن کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس لیے اردو کے اہم نقادوں اور محققین نے نظیر کو ہندو مسلم سماج کا نمایندہ تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

> ''نظیر دراصل اسی ہندوی روایت کی شمع روشن کرتے ہیں جس کا براہ راست رشتہ مولود ناموں، معراج ناموں، چکی ناموں وغیرہ کی ہندوی روایت سے ہے۔ نظیر کی نظمیں بنجارہ نامہ، آدمی نامہ، ہنس نامہ، عاشق نامہ، تندرستی نامہ، فنانامہ، جوگی نامہ، روٹی نامہ، کوڑی نامہ اسی روایت کے رنگ و مزاج کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں جن کے بحر و وزن اور الفاظ پر ہندوستانیت کا مزاج غالب ہے اور ساتھ ہی ہیئت اور اصناف پر فارسی روایت کا اثر بھی موجود ہے۔''(۲)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''اس کی شاعری اسی شہر کی ہندو مسلم ثقافت کی امتزاجی رویوں سے اپنی منفرد شناخت کے ساتھ ظاہر ہونے والی تھی۔''(۳)

ڈاکٹر شمیم حنفی رقمطراز ہیں:

''ان کی شاعری میں نہ صرف ہندوی مزاج و موضوعات بلکہ ہندوستانی زبانوں کے الفاظ بھی برسوں بعد پھر سے ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے۔ انھیں اس طرح ملانے اور دو کلچروں کو ایک دوسرے میں ضم اور مدغم کرنے اور انھیں ایک نئی صورت دینے کا کام اس دور میں سوائے نظیر اکبر آبادی کے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔''(۴)

حقیقت یہ ہے کہ نظیر نے عوام کے مسائل کو عوام ہی کے نقطہ نظر سے دیکھا تھا اور عام انسانوں کے بیچ میں رہ کر ان کی زندگی کے مسائل کو محسوس کیا تھا۔ احتشام حسین نے اپنی کتاب ''تنقیدی جائزے'' کے ایک مضمون ''نظیر اکبر آبادی اور عوام'' میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے:

''عوام کی ہمدردی کا بہترین ذریعہ نظیر نے پیش کیا تھا کہ وہ ان کے بہت سے بے بنیاد توہمات کو ان کے دل سے نکال کر انھیں بتا دیں کہ آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی سب کے برابر ہیں اور جذبات و احساسات میں خواص سے مشابہت رکھتے ہیں۔''(۵)

نظیر کی انسان دوستی کی ایک روشن مثال ان کی نظم 'آدمی نامہ' ہے، وہ انسان کی بنیادی پہچان بشریت کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں، جس میں سب انسان برابر ہیں، نظیر لکھتے ہیں:

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی(۶)

اب حقیقت یہ بھی ہے کہ نظیر نے زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور سماج کے اونچے نیچے طبقے اور عوام و خواص کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی کو جیسا دیکھا ویسا ہی پیش کر دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انسان کو انسان کے کام آنا چاہیے۔ اور ایک دوسرے کے کام آنا ہی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے۔ ورنہ دنیاوی چیزیں تو سب یہیں رہ جاتی ہیں۔ ان ضمن میں ان کی نظم "بنجارہ نامہ" خاص اہمیت رکھتی ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں ،مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کو نقارہ
کیا بدھیا ، بھینسا ، بیل شتر ، کیا گوئین ،پلّا ، سر بھارا
کیا گیہوں ، چانول ، موٹھ ، مٹر ، کیا آگ ، دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

گر تو ہے لکھّی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل ، تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکّر ، مصری ، قند گری ، کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ ، منقے ، سونٹھ ، مرچ ، کیا کیسر ، لونگ ، سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

توبدھیا لادے ،بیل بھرے ، جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ، ناتی پوتا کیا ، اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ[۷]

نظیر انسانی اقدار اور انسان پر کھل کر بات کرتے ہیں، اس سلسلے میں نہ انھیں اپنی معلمی کے پیشے کی پرواہے اور نہ ہی اپنے شاعرانہ مقام کی۔ شمس الحق عثمانی نے اپنی مرتبہ کتاب ''نظیر نامہ'' میں آل احمد سرور کا ایک مضمون '' نظیر اور عوام'' شامل کیا ہے، اس میں نظیر کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

''نظیر کا زندگی اور فن کا تصور انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ محض قید کی حد میں آزادی کی حد بڑھانے پر اکتفانہ کریں۔ بلکہ بعض زنجیروں کو توڑ دیں ۔۔۔۔۔ عوام کی شاعری بعض زنجیروں کو توڑنے پر مجبور ہوتی ہے۔''[۸]

ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نظیر نے ہندوستانی عوام کو اپنا کر اپنی شاعری کو کبھی خشک نہ ہونے والے چشمے سے ملا لیا۔ انھوں نے عوام کی زندگی سے عملی قربت حاصل کرلی اور ان کے جذبات ان کے فکر و عمل میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ بہ قول آل احمد سرور کے عوام کی آنکھ، کان، ناک بن گئے تھے۔ نظیر نے کسی ایسی تہذیب کی داغ بیل نہیں ڈالی جو ایک خاص طبقے کے مفاد کی محافظ یا ترجمان ہوتی بلکہ انھوں نے اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کی جس نے تہذیب کو دربار اور بازار میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ عوام کی خوشنودی کے لیے وقف کر دیا۔ بلا امتیاز مذہب و ملت یہ ہر تہوار میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی لطف حاصل کرتے تھے اور عوام کو بھی اپنی شاعری کے ذریعہ محظوظ کرتے تھے۔ ان کی شاعری نے انسان کو سماج میں رہ کر پر امن طور پر زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھایا۔''[۹]

تیوہاروں، تقریبوں اور میلوں کے ذریعہ باہمی بغض و حسد دور ہو جاتا ہے اور اختلافات کی کھائیاں پٹ جاتی ہیں اور ہر شخص ایک دوسرے کا ہمدرد اور غمگسار نظر آتا ہے۔ ان کے ذریعہ مساوات اور غیر جانبداری کا درس بھی ملتا ہے۔ امیر، غریب، ادنیٰ، اعلیٰ اور چھوٹے بڑے کا فرق آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے۔ ان تیوہاروں، تقریبوں اور میلوں کے ذریعہ میل، محبت، مساوات، ہمدردی اور رواداری کا درس ملتا ہے۔ یک جہتی کا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے۔ دوسرے کا غم اپنا غم اور دوسرے کی خوشی اپنی خوشی محسوس ہونے لگتی ہے۔ نظیر کی سب سے بڑی خوبی بے تعصبی، رواداری اور وسیع النظری ہے۔ ان کی بلند نظری نے مذہبی اختلافات کی سد سکندری کو ڈھا دیا۔ جو اگر عید، شب برات، حضرت سلیم چشتی پر اس جوش و ولولہ سے نظم لکھ سکتا ہے کہ وہ ایک ایمان دار مسلمان کے خیالات کا آئینہ ہو تو ہولی، دیوالی، بابانانک شاہ گرو، کنھیا جی وغیرہ کی ثناوصفت میں بھی ایسی ایسی گل فشانیاں کر سکتا ہے کہ ناواقف اس دھوکے میں پڑ جائے کہ یہ کسی دھرماتما ہندو کے دل سے نکلے ہوئے وہ نغمے ہیں جو عقیدت واردات، بھگتی اور آرادھنا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

نظیر نے اپنی نظموں میں ہر طرح کے پیشے کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ غریبی کی وجہ سے ان کو کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سماج کی آبرو عوام کی زندگی سے وابستہ ہے اگر دیکھا جائے تو انسانی ہمدردی کا سارا حسن عوام سے ہے۔ ان کی بیشتر نظموں کا بیشتر حصہ عوام سے متعلق ہے۔ نظیر نے انسان کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ اپنی نظموں میں انھوں نے مفلسی، کلجگ، بنجارہ نامہ جیسی نظمیں لکھ کر یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ نظیر ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج انسان ہے جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسان کی بے قدری نہیں کرتا۔ جو انسانی زندگی کی کم مائیگی کا احساس پیدا کر کے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا۔ وہ ہمارے اندر ایک تقویت پیدا کرتا ہے اور ہم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں۔

زندگی سے ان کی یہ انسیت ان کی شاعری میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ نظیر نے جب عوام کی تکلیفوں اور مسائل کو دیکھا تو ان کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ انھوں نے دنیا کی بے ثباتی اور قدرت کی ہر چیز کو وقتی قرار دیا۔ اور لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ اس میں ناحق پریشان نہ ہوں۔ اس طرح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظیر کی شاعری کا موضوع عوام ہیں۔ انھوں نے عوام کے مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اور ہر طبقے کے لوگوں کو جگہ دی ہے۔ نظیر نے میلے ٹھیلے، گدا فقیر، تل کے لڈو، مٹھائی کی دکان، حلوائی، مذہبی تہوار وغیرہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور اس کو موضوع سخن قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ پروین اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "نظیر اکبر آبادی بحیثیت عوامی شاعر" میں لکھتی ہیں:

> "عوام اور عوام کی زندگی سے وابستہ تمام عناصر پر نظیر نے گہری نظر ڈالی ہے۔ زندگی کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس پر نظیر کی نظر نہ پڑی ہو۔ وہ ہر گوشہ پر قلم بخوبی اٹھاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو انسان (عوام) اور انسانی زندگی (عوامی زندگی) سے بے باک اور بے لاگ محبت ہے۔ وہ عوام کے غم کو محسوس کر کے ان کے غم کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔ نظیر عام لوگوں کی فرمائش اس لیے پوری کرتے تھے کہ ان کو عوام سے ہمدردی تھی۔ وہ پوری طرح سے عوام سے واقف تھے، اور ان میں رچ بس گئے تھے۔ ان کی مجبوریوں اور پریشانیوں سے ان کو ہمدردی تھی۔ وہ یہ بات بھول جاتے تھے کہ وہ ایک معلم بھی ہیں۔ اس لیے وہ ہر رنگ میں عوام کو پہچانتے ہیں اور انسان اور انسانیت کے اس حسن پر ان کی گہری نظر پڑتی ہے۔"(۱۰)

نظیر انسان کو دنیا کے صحیح اور غلط حالات سے واقف کراتے ہیں تاکہ انسان اس نشیب و فراز سے واقف ہو سکے۔ عبدالغفور شہباز نے اپنی کتاب "زندگانی بے نظیر" میں لکھا ہے:

> "میرے خیال میں اردو کے شعرا میں شاید ہی کسی کو انسانی طبیعت کا اس قدر صحیح، عمیق تجربہ ہو جتنا کہ اس کی ہر نظم سے پایا جاتا ہے۔ اس کی دن رات اس کام کے لیے آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور وہ دن رات انسان کا ہی تماشا دیکھا کرتا تھا۔ اور انسان کے حالات جاننے کو ہی مقصد اعظم جانتا تھا۔" (۱۱)

نظیر کی عوام دوستی اور انسان دوستی ان کو صرف ایک قومی شاعر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی شاعر بنا دیتی ہے۔ان کی نظمیں انسانی جذبات کی بہترین ترجمان ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد تب تک رواداری تھی جب تک لوگ ایک دوسرے تیوہاروں اور تقریبات میں اسے اپنا سمجھ کر شرکت کرتے تھے، انسان دوستی کی اس روایت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے دوبارہ ایسا کرنا ضروری ہے تاکہ ایک بار پھر تفرقہ بازی کا خاتمہ ہو اور امن و آشتی کا دور دورہ ہو۔یہ انسان دوستی نہ صرف بر صغیر کے خطے میں امن پیدا کرے گی، بلکہ عالمی گاؤں میں تیسری جنگ عظیم کے بڑھتے ہوئے خطرات کو بھی کم کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔

حوالہ جات

1. Some Cultural Aspect of Muslim Rule in India,Dehli: Pub, Idarah Adbiyat-i-Dehli,1979,P.207 S.M.Jafar ,

۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو، جلد سوم،لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۰۶ء، ص ۱۰۰۴

۳۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳، ص ۵۵۲

۴۔ شمیم حنفی، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء، ص ۵۲

۵۔ احتشام حسین، تنقیدی جائزے، حیدر آباد:ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۴ء، ص ۱۸۲

۶۔ نظیر اکبر آبادی، کلیات نظیر مع مقدمہ، از اظہر راہی، الہ آباد: پبلشر رام نرائن بنی مادھو،۲۔کٹرہ روڈ، مطبع نیشنل آرٹ پرنٹرس سرائے گڈھی الہ آباد، طبع اول،۱۹۷۶ء، ص ۱۷۲ تا ۱۷۴

۷۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۸۔ شمس الحق عثمانی، نظیر نامہ، دہلی: صبوحی پبلی کیشنز،۱۹۷۹ء، ص ۲۱۳

۹۔ ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی ، نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ ،ناشر مصنف، مطبع ، فیض آباد: نشاط آفسٹ پریس، ٹانڈہ، فروری ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۸۔۱۰۹

۱۰۔ طاہرہ پروین،ڈاکٹر، نظیر اکبر آبادی بحیثیت عوامی شاعر، ناشر مصنفہ، الہ آباد: ۱۱۸۲، پرانا کٹرہ، من موہن پارک ، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۔۳۶

۱۱۔ عبد الغفور شہباز، زندگانی بے نظیر، لکھنؤ:نول کشور پریس، ۱۹۰۰ء، ص ۲۴۹